محمد الیاس کبیر

ذوالکفل بخاریؒ کی نظم ''کتبہ'' ـــــ ایک نوحۂ ناتمام

ذوالکفل بخاری کا شمار اُن معدودے چند تخلیق کاروں میں ہوتا ہے جو بہت ہی قلیل وقت میں تخلیقی شعور سے آگاہ ہوگئے۔ انھوں نے ایسے وقت میں جان جانِ آفریں کے سپرد کی جب ان کے فن کا سورج ''سوا نیزے'' پر تھا۔ وہ بہت جلد ترقی کی منازل طے کر گئے اور کامیابیوں سے اپنا دامن بھر لیا۔ شاعری، نثر، کالم نگاری، صحافت، لغت نگاری، تبصرہ نگاری، تراجم، تنقید کے میدان میں انھوں نے اپنے فن کا لوہا کچھ اس طرح منوایا کہ بڑے بڑے ادیبوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرالی۔ ذوالکفل بخاری نے اپنی نظموں کو اسلوب، ہیئت، مواد اور موضوع و مضامین کے اعتبار سے ایک جدید لب ولہجہ اور روایتِ جدید دی ہے۔ ان کے ہاں داخلیت کا اظہار ملتا ہے اور داخلیت بہر حال خارجی حالات سے جنم لیتی ہے۔ وہ اپنے غم آگیں احساسات و تاثرات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ان کا لب ولہجہ بہ نسبت دیگر شعرا تند و تیز اور پر جوش نہیں ہونے پاتا بلکہ اس میں ایک دھیمی دھیمی آنچ کی سی کیفیت رہتی ہے جو ایک طرف تو فن کی شان برقرار رکھتی ہے اور دوسری طرف معاشرتی و سماجی الجھنوں کا احساس قاری کے ذہن تک رسائی پاتا ہے۔ اُن کی نظمیں الفاظ کے مناسب انتخاب اور جذبات و تخیلات کی بلندی کے باعث انفرادیت کی حامل ہیں۔

کتبہ اور قبر، موت کی علامت ہونے کے باوجود حیات بعد ممات کی آرزو کے مظہر بھی رہے ہیں۔ اپنے ہم عمروں اور ہم عصروں کی موت کی نوحہ گری میں فی الاصل احساسِ فنا کے بین بین تمنائے حیات کا ایک گوشہ بھی موجود ہوتا ہے۔ اگر تصویر کا دوسرا رخ دیکھا جائے تو یہ احساس دل کے کسی گوشے میں جاگزیں ہوتا ہے کہ اس میں دنیا کی بے ثباتی اور بے اعتنائی جلوہ ریز ہے۔ کتبہ اُس موت کی پہچان ہے جو حیات افروز ہے۔ جس میں زندگی مسرت آمیز ہے، لیکن پھر بھی اس میں کرب و اذیت کے پہلو حیرت انگیز ہیں۔ یادِ ایام کا ایک ایک پل اور ایک ایک لمحہ ناقابل فراموش ہوتا ہے۔

۲۰۰۵ء میں ذوالکفل بخاری نے اپنے عزیز ترین دوست انجینئر حافظ محمد ارشاد کی دل گیر جواں مرگ پر ایک نظم ''کتبہ'' لکھی، جو بہت پسند کی گئی اور بڑی دیر اور دور تک اس کی بازگشت سنی گئی۔ یہ نظم اپنی فکری اور معنوی محاسن کی وجہ سے انفرادیت کی حامل ہے۔ دونوں دوستوں میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ دونوں ٹریفک حادثے کا شکار ہوئے۔ دونوں مخلص اور ملنسار تھے۔ دونوں نے بہت کم عمر پائی اور دونوں نے عین عالم شباب میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اس لیے یہ نظم جہاں ان کے دوست کا کتبہ ہے وہیں اس کا انطباق خود انہی پر بھی ہوتا ہے۔ انھیں زندگی میں ہی اپنی موت کا ادراک ہوگیا

تھا۔ جبھی تو یہ اُن کے اپنے نوحے کی نوشت معلوم ہوتی ہے۔ یعنی مرثیۂ ذات (Self Epitaph)۔ نظم پڑھتے ہوئے خیال بار بار ذوالکفل بخاری کی طرف بے اختیار چلا جاتا ہے کہ یہ خوبیاں اُن میں بھی بدرجہ اتم موجود تھیں۔

فنی اعتبار سے یہ نظم آزاد ہیئت میں ہے۔ چونکہ یہ ہیئت انھیں بہت پسند تھی، اس لیے ان کی اکثر نظمیں اسی Pattren میں لکھی گئی ہیں۔ انھوں نے چھوٹے بڑے مصرعوں میں خیالِ مرگ کو فنکارانہ چابک دستی اور کمال مہارت سے بیان کیا ہے۔ عنوان اور موضوع میں ہم آہنگی شاعر کی خلاقانہ حسیت (Creative Sensibility) کا پتا دیتی ہے۔ اس نظم کی سادگی اور دلکشی ابتداء سے آخر تک قاری کے دل کو اپنے سحر میں لیے رکھتی ہے کیونکہ یہ جدید شاعری کے تمام لوازم ومقتضیات کی حامل ہے۔ اس نظم کی قرأت سے فوری طور پر جو مضامین ذہن پر مرتسم ہوتے ہیں، کچھ اس طرح ہیں: احساسِ فنا، عدم تکمیل حیات، جذباتی رفاقت، فلسفیانہ اور منطقی انداز، علامتی پیرایہ بیان، احساسِ جواں مرگ۔ شاعر کا اردو، فارسی اور عربی مرکبات سے لبریز اسلوب اور بیک وقت ہندی ضمیات کے حوالہ جات، اشارات پر عبور اور ان کی تفہیم عمیق نگہی کا واضح ثبوت ہے۔ وہ ایک وسیع المطالعہ شخص تھے اور عربی، فارسی اور انگریزی کے علاوہ ہندی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ ''کتبہ'' میں انھوں نے نئے عناصر اور نئی تراکیب وضع کی ہیں جو عربی، فارسی اور ہندی سے ان کے غیر معمولی شغف کا ثبوت ہیں۔ ان تراکیب کی جدت اور ندرت نے نظم کے فنی حسن کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔

مثلاً فارسی تراکیب ''جہاں گردِ زمانہ، ناکشودہ محوسفر، پُرتحیر، تشنہ دہانی'' اور ہندی الفاظ ''مہا گیانی، سبھا ساجن، شَبْد، بانی، پریمی، سیلانی پریتم، بھیدیا، جیون جگت، سنجوگ، سنگت، سانجھ، سمبندھ، جیون'' نظم کے رنگینیٔ حسن کو فزوں تر کرنے کا باعث ہیں۔

''کتبہ'' میں وہ جملہ فنی محاسن ملتے ہیں جو کلاسیکی شعری روایت کا حصہ ہیں۔ لیکن یہ صنعتیں صرف خالی صنعت سازی نہیں ہے۔ یہ کسی طور بھی معنی اور ابلاغ کا خون نہیں ہونے دیتیں۔ ان کے مصرعوں میں صنعت سرحرفی تماثل (Alliteration) کی بہترین مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً: ''بھیدیا، بھیدوں بھرے'' اور ''سنجوگ، سنگت، سانجھ''۔ ہندی لہجہ میں ''ہم صوتیت'' کے حسن کو مدِنظر رکھا گیا ہے۔

ایک خصوصی احساس جو شاعر کی ناگہانی وفات کے بموجب بالآخر سوانحی ثابت ہوا۔ نظم کی ابتداء میں تأسف اور تحیر خود باعثِ حیرت ہے۔ جسے شاعر نے اپنے دوست کے بچھڑنے پر بے ساختہ نظم میں متشکل کر دیا ہے۔ ذوالکفل بخاری جہاں گرد تو نہ تھے لیکن انھوں نے سفر کی بعض شرائط ضرور پوری کی تھیں۔ ان کی جہاں گردی کا مطمحِ نظر صرف اور صرف حجاز مقدس کی منزل پر پہنچنا تھا۔ انھوں نے مختصر مگر جامع سفرنامہ (''روشنی، پھول، صبا.....) بھی لکھا۔ جو ان کے صاحبِ طرز نثّار ہونے کا بیّن ثبوت ہے۔ انھوں نے اپنے دوست کو ''جہاں گردِ زمانہ'' قرار دے کر ایسے سفر کا راہی بنایا

ہے جو ابھی نہیں کھلا۔ جو مختلف، اچھوتا، منفرد اور لامحدود ہے۔ ہر دم متحرک اور ہر وقت نئی نئی منزلوں کو دیکھنے کا مشتاق اور متجسس سیاح (Curious Turist)۔ یہ مناظر اور یہ منازل ابھی اس کی آنکھوں سے اوجھل ہیں، ابھی اس کے در وا نہیں ہوئے۔ یہ سب کچھ ابھی اس کے چشمِ تخیل میں پنہاں ہے، وہ انھیں واشگاف کرنے کا متمنی ہے۔ ان منازل کی تلاش میں سرگرداں مسافر سفرِ مسلسل کی کیفیت میں مبتلا ہے۔ وہ سب کچھ دیکھنا چاہتا ہے اور دوسروں کو اس میں شریک کرنے کا خواہ ہے۔ نظم کی ابتداء ہی اتنی جاندار ہے کہ اس میں حیاتِ جاوداں اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

وہ جہاں گردِ زمانہ
ناکشودہ منظروں کے کھوج میں محوِ سفر
نت نئی راہوں پہ پھیلی
شاعر خود تشنہ لب ہے، اور یہ تشنگی

شاعر کی یہ تشنگی ہزاروں سالوں پر محیط ہے جو اُسے صحرائے عرب سے آبیاتِ ہند تک لائی لیکن یہ پھر بھی بے آبی کا شکار رہی اور اُس کی مرگِ ناوقت پر منتج ہوئی۔ یہ تشنہ دہانی بے ثمری نہ رہی بے وفائی حیات تو بہرحال ثابت ہوئی۔ شاعر نے مجید امجد کی نظمیات کے ہاں موجود جو عدم طمانیتِ حیات کا حوالہ ہے اس کا اظہار اور ادراک اپنی حیات کے نصف النہار میں اپنے ایک دوست کے حوالے سے مگر اپنے نوحے کو ہی رقم کیا ہے۔

پُر تحیرّ روشنی کی اَن چھوئی ٹھنڈک کا پیاسا
صد ہزاراں سال کی تشنہ دہانی لے گیا

نظم کے اختتام میں خلائے حیات کا شدید احساس ہے جو لہجے میں بے ساختگی، برجستگی، خلوص، محبت، رعنائی خیال اور ترنم ریزی پیدا کر رہا ہے۔ شاعر کا لاشعور کہیں نہ کہیں روایت سے جڑا ہوا ہے۔ انتہائے نظم تک تخلیق کار نے غم و اندوہ کی کتنی انتہاؤں کو چھوا ہے اور اس کے ذائقے سے آشنا ہوا ہے۔ یادِ رفتہ نے اُسے بڑے جانگسل انداز سے ستایا ہوگا۔ شاعر نے باطن کی روشنی اور اُجلے پن کو آنکھوں کی چمک کی صورت میں تلاش کیا ہے۔ باضمیر اور صاحبِ بصیرت حیات کی جدائی بہرحال ایک المناک دکھ اور اندوہ ناک کرب ہوتا ہے۔ جو عین عالم شباب میں بے داغ، روزِ روشن کی طرح شفاف، واضح اور لہو و لعب سے پاک جوانی لے کر چلے گئے۔ جوانی کا یہ اُجلا اور نکھرا پن بہت کم لوگوں کے حصے میں آیا ہے۔

روشنی باطن کی، آنکھوں کی چمک
دوپہر کی دھوپ سی اُجلی جوانی لے گیا

یہاں تک آتے آتے شاعر کا رجحان ہندی الفاظ کی طرف بے ساختہ چلا گیا ہے۔ ویسے بھی وہ اپنی نظم و نثر میں

ہندی الفاظ کو کثرت سے استعمال کرتے تھے۔ یہ سوال ابھی تشنہ تکمیل ہے کہ اس کی کیا وجہ تھی؟ ذیل کے ہندی الفاظ میں ایک ایسا صوتی آہنگ ہے جو موسیقیت اور نغمگی پیدا کر رہے ہیں۔ وہ جو مہا گیانی (عارفِ کامل) تھا، وہ اپنی گیان دانی (دماغ، ذہن)، شبد (الفاظ)، بانی (بول، زبان) لے گیا ہے تو اس کی عدم موجودگی میں محبت کے سارے رنگ پھیکے اور بے رنگ ہیں۔ اُس کے بغیر محفلیں اداس اور سونی سونی ہیں۔ کیونکہ وہ سجھا ساجن (محفل کا دوست) اور پریتم (محبوب) تھا۔ وہ ایسا بھیدیا (رازدار) تھا جس کی جیون جگت (دورِ حیات) خود راز تھی۔ وہ گیا ہے تو اپنے سنجوگ (رفاقت) سمبندھ (تعلق) اور زندگی کی پوری کہانی بھی ساتھ ہی لے گیا ہے۔

اک مہا گیانی جو اپنی گیان دانی لے گیا
شَبد اپنے لے گیا وہ، اپنی بانی لے گیا
وہ سجھا ساجن، پریمی، ہاں وہ سیلانی پریتم
بھیدیا، بھیدوں بھرے جیون جگت کا بھیدیا
سنجوگ، سنگت، سانجھ کے، سمبندھ کے بھیدوں بھری
جیون کہانی لے گیا

یہ بپتا لکھتے ہوئے ذوالکفل بخاری کا کہنا ہے کہ کتنے عظیم وارفع لوگ چلے گئے۔ ان کے کردار و عمل رہ گئے ہیں۔ ان کی عدم موجودگی میں صرف بیکار اور لایعنی مقاصد میں سرگرداں لوگ ہیں۔ جن کے وجود سے کسی کو کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا۔ ایک خلاء حیات ہے جو کبھی بھی پُر نہیں ہوسکتا۔ یہ ہمارے معاشرے کا ایسا المیہ ہے کہ صرف آدمی رہ گئے ہیں، انسانیت مرگئی ہے۔ ہم قحط الرجال کے دور میں زندہ ہیں۔ ملاحظہ کریں کہ انھوں نے کمال مہارت سے اس کمی کا اظہار کیا ہے:

کردار باقی رہ گئے
بے کار باقی رہ گئے

یہ نظم عصری شعور میں ایک نئے اسلوب کا ایسا فن پارہ ہے جسے رثائی شاعری کا خوبصورت نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اپنی زبان اور Treatment کے لحاظ سے یہ توجہ کھینچنے والی نظم ہے جو پڑھنے والے میں گداز بھی پیدا کرتی ہے۔ غرض ''کتبہ'' ایک کامیاب اور زندہ رہنے والی نظم ہے۔

(یکم جنوری ۲۰۱۰ء)